رباعیاتِ اقبالؒ

غلام مرتضیٰ آزاد، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد

رباعیاتِ اقبالؔ کو سمجھنے اور ان کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے پہلے رباعی کی تعریف کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔

مضامین جلیلہ کو آسان اور مؤثر الفاظ سے ان چار مصرعوں میں بیان کرنا جو بحر ہزج کے مروجہ چوبیس اوزان میں سے کسی ایک وزن پر ہوں۔

مندرجہ بالا عبارت میں تین خط کشیدہ الفاظ رباعی کی دلکش عمارت کے تین رکن ہیں۔ ان میں سے اگر ایک رکن گرا دیا جائے تو ساری عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔

۱۔ مضامین جلیلہ سے ہماری مراد، مسائل اخلاق، مسائل فلسفہ، مسائل تصوف، مسائل تمدن و معاشرت، مسائل مذہب اور وارداتِ عشق ہے۔

تلوک چند محرومؔ کی رباعیات پر علامہ اقبالؔ نے جو دیباچہ لکھا ہے اس کا ایک اقتباس قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ خود علامہ اقبالؔ "مضامینِ جلیلہ" سے کیا مراد لیتے تھے۔

"مدح وذم، عشق و تصوف، مذہب و اخلاق اور پند و نصائح کے مضامین جس خوش اسلوبی، دلفریبی اور اختصار کے ساتھ فارسی رباعی میں ادا ہوئے ہیں وہ کسی دوسری زبان میں ادا نہ ہو سکے۔"

۲۔ چار مصرعے، رباعی کے چار مصرعوں میں سے پہلے دو مصرعوں اور چوتھے مصرعہ کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے، تیسرا مصرعہ کبھی ہم قافیہ ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ میرے مطالعہ سے آج تک کوئی ایسی رباعی نہیں گزری جس کے مذکورہ بالا تین مصرعے ہم قافیہ نہ ہوں۔

۳۔ بحر ہزج ۔ انتہائی ترنم ریز اور نشاط انگیز بحر ہے شاید اسی وجہ سے رباعی کے لئے اس کو منتخب کیا گیا ہے ۔ وزن ہے :

مفاعی لن ، مفاعی لن ، مفاعی لن ، مفاعی لن ۔

ایک سرسری اندازے کے مطابق علامہ اقبالؔ کی رباعیات کی مجموعی تعداد ۵۸۹ ہے ، جن میں ۵۳۷ فارسی اور ۵۲ اُردو کی رباعیات ہیں ۔

یہ دیکھ کر قارئین کو حیرت ہوگی کہ علامہ اقبالؔ کی جملہ رباعیات میں ، رباعی کی ایک شرط اور بعض فارسی رباعیات میں دو شرطیں مفقود ہیں ۔ علامہ اقبالؔ کی جملہ رباعیات ، مفاعی لن ، مفاعی لن ، فعولن یا فعولان کے وزن پر ہیں ۔ (اگرچہ یہ وزن بحر ہزج ہی سے متعلق ہے) لیکن شعراء نے اسے استعمال نہیں کیا ۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ رباعی کے تین مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے ۔ علامہ اقبالؔ کی بعض فارسی رباعیات میں یہ شرط بھی نہیں پائی جاتی ۔ ان شرائط کی عدم موجودگی میں یہ بات محلِ نظر ہے کہ اقبالؔ کی رباعیات کو رباعیات کہیں یا قطعات ۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبالؔ نے اپنے ان قطعات یا رباعیات (جنہیں اقبالؔ خود رباعی سمجھتے ہیں) کے لئے جس وزن کا انتخاب کیا ہے وہ بلا کا ترنم خیز ہے ۔

باعتبارِ مضمون رباعیاتِ اقبالؔ کی تقسیم اور تشریح سے پیشتر ایک نکتہ کا اجمالی طور پر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے ۔ رباعی ، جیسا کہ جملہ شعراء کا اتفاق ہے مشکل ترین صنفِ سخن ہے ۔ مضامین کے تلاطم خیز قلزم بے ساحل کو ایک ساغر بنا دینا کوئی آسان کام نہیں ۔ رباعی شاعر کے پروازِ تخیل کی معراج ، قوتِ فکر کی حد ، ژرف بینی کی انتہا ، قدرتِ کلام کا امتحان اور تجرباتِ حیات کا نچوڑ ہے ۔

مضامین کے اعتبار سے اقبالؔ کی رباعیات کو ہم مختلف عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں :-

مذہبی رباعیات

مذہبی رباعیات سے مراد وہ رباعیات ہیں جن میں علامہ اقبالؔ نے مابعد الطبیعیات اور الٰہیات کے متعلق اپنے عقائد پیش کئے ہیں ، وجودِ باری پر اپنے مخصوص انداز میں دلائل دیئے ہیں ، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کی ہے ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں ہدیۂ عقیدت

پیش کیا ہے۔ اور قرآن مجید کی کسی آیت یا حدیث کے کسی حصہ کی تشریح کی ہے۔

مثلاً علامہ اقبال کی یہ رباعی ؎

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

مذہبی رباعی ہے۔ قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی تعلیمات پیش کی ہیں۔

اور درج ذیل رباعی

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر — حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے — اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

بھی مذہبی رباعی ہے اِس لئے کہ اس میں بارگاہِ ایزدی سے خلوصِ قلب کے ساتھ التجا کی گئی ہے کہ مسلمان قوم کی حالت سُدھر جائے۔

متصوفانہ رباعیات

وہ رباعیات جن میں مسائل تصوّف یعنی وحدۃ الوجود، مظاہر خداوندی، تجلیاتِ الٰہی کی بوقلمونی، نمودِ بے نمود، مشاہدۂ الٰہی، ذکرِ الٰہی، فیضانِ الٰہی، عظمتِ انسان، طہارتِ نفس، تحفظِ نفس، ضبطِ نفس، بقائے روح، عظمتِ قلب، تزکیۂ قلب، مرشد کی ضرورت، مقاماتِ سلوک، لذتِ سلوک، عشقِ حقیقی، مراقبہ، بے ہمہ و باہمہ، جلوت میں خلوت، حاسۂ باطنی، ترکِ خودی، کفر کی حقیقت، وجہِ تخلیقِ عالم، خدا اور مخلوق کا تعلق وغیرہ مضامین کا بیان ہو، مثلاً

دمِ عارف نسیمِ صبح دم ہے — اسی سے ریشۂ معنی میں نم ہے
اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

اخلاقی رباعیات

اخلاقی رباعیات میں عموماً ترکِ دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، علم، جود و سخا کی ترغیب اور ریاکاری سے نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اقبال زندگی کے طوفان سے بھاگ نکلنے کے قائل نہیں۔ اس لئے انہوں نے ترکِ دنیا کی بجائے استقلال کی تعلیم دی۔ تواضع اور خاکساری کی بجائے ان کے ہاں خودی کی تعلیم و تلقین پائی جاتی ہے، وہ فقر کے قائل تھے

لیکن ایسا فقر جو باہمہ تہی دستی محسود امیری اور سجدہ گاہ کج کلاہی ہو۔

حکیمی نامسلمانی خودی کی ۔۔۔ کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی
تجھے گُر فقر و شاہی کا بتادوں ۔۔۔ غریبی میں نگہبانی خودی کی

سماجی وسیاسی رباعیات

سماجی رباعیات میں اپنی قوم کا رونا رویا جاتا ہے اور سیاسی رباعیات میں جملہ اقوامِ عالم کا۔ اقبالؔ سے پہلے اُردو اور فارسی کے شعراء سماجی رباعیات میں چرخِ کج رفتار کے ظلم وستم کا رونا رویا کرتے تھے اور بس۔ اقبالؔ نے اس روایت کو بدل دیا۔

دگرگوں کشورِ ہندوستان است ۔۔۔ دگرگوں آں زمین وآسمان است
مجواز ما نمازِ پنجگانہ ۔۔۔ غلاماں راصف آرائی گران است

اصلاحی رباعیات

اس سے مراد وہ رباعیات ہیں جن میں علامہ اقبالؔ نے قوم کے زاویۂ فکر ونظر کو درست کرنے کی کوشش کی ہے، انہیں عصا بدست اندھوں کی طرح غیر اقوام کی رذیل عادات و اخلاق کی کورانہ تقلید سے باز رہنے کی تلقین کی ہے، آپس کی خطرناک نا چاقیاں دُور کر کے نفس واحدہ بن جانے کی اپیل کی ہے۔ اور بعض ایسے رسم ورواج جو قوم کے ذہنی، سماجی اور سیاسی حالات کو تباہی سے دوچار کر رہے تھے ان کی بھرپور الفاظ میں مذمت کی ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبالؔ نے نوجوان، ملّا، پیر، صوفی، شاعر اور عورت کی اصلاح پر خاص زور دیا ہے۔

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی ۔۔۔ یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار ۔۔۔ غلامی سے ہے بدتر بے یقینی

رندانہ رباعیات

رندانہ رباعیات میں ہم ان رباعیات کو بھی لے آئے ہیں جن میں علامہ اقبالؔ نے حالتِ رندانہ اور کیفیتِ مستانہ میں جنّت، دوزخ اور حشر وغیرہ کا ذکر کیا ہے، خدا سے شوخیاں کی ہیں اور کہیں کہیں خدا کو مخاطب کر کے اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار کیا ہے۔

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے ۔۔۔ خداوندا خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی استغفر اللہ　　　یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

زعیمانہ رباعیات

وہ رباعیات جن میں اقبالؔ نے بنی نوعِ انسان کو علی العموم اور مسلمان قوم کو بالخصوص، خوابِ غفلت سے بیدار کرنے، جمود و تعطل اور غیر اقوام کی غلامی کی زنجیریں توڑ دینے، اپنے ماحول پر غور کرنے، اتفاق و اتحاد پیدا کرنے، دنیا پہ چھا جانے اور کائنات کی حدود پھلانگ جانے کا حیات بخش نغمہ سنایا ہے۔

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است　　　دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است

اگر بیمے نداری بحر صحرا است　　　وگر داری بہر موجش نہنگ است

حکیمانہ رباعیات

اس سے ہماری مراد وہ رباعیات ہیں جن میں اقبالؔ نے مظاہرِ فطرت یا تاریخی واقعات سے کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے۔

گلہ از سختی ایّام بگذار　　　کہ سختی ناکشیدہ کم عیّار است

نمی دانی کہ آب جوئباراں　　　اگر بر سنگ غلطد خوشگوار است

ظریفانہ رباعیات

میرے خیال میں اس عنوان کی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں۔ مثال ملاحظہ ہو ؎

برہمن را نگویم ہیچ کارہ　　　کند سنگِ گراں را پارہ پارہ

نیاید جز بہ زور دست و بازو　　　خدائے را تراشیدن زخارہ

ذاتی رباعیات

رباعیات کی وہ قسم ہے جن میں شاعر اپنے متعلق کچھ بتاتا ہے، دیگر شعراء کی ذاتی رباعیات میں فخریہ رباعیات بھی شامل ہیں، اقبالؔ کو جو مقام حاصل تھا وہ شاعرانہ تعلّی سے بلند تھا۔ البتہ قوم کو علّامہ صاحب کے متعلق جو غلط فہمیاں تھیں، ان کے ازالہ کے لئے اقبالؔ کو اپنے ہی الفاظ میں اپنا تعارف کرانا پڑا ؎

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　　غلام طغرل و سنجر نہیں میں

جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن — کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

مستفسرانہ رباعیات

شاعر جب افکار کی وادی میں سفر کرتا ہے تو ایک مقام وہ بھی آتا ہے جسے مقامِ تحیّر کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر شاعر کبھی اپنے آپ سے اور کبھی سارے جہان سے سوالات کرتا ہے لیکن یہ سوالات جواب حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ اظہار تحیّر کے لئے ہوتے ہیں۔ ایسی رباعیات کو میں نے مستفسرانہ رباعیات کا نام دیا ہے یعنی وہ رباعیات جن میں اقبال نے بیانیہ (NARRATIVE) طرزِ کلام کی بجائے سوالیہ (INTERROGATIVE) اندازِ کلام اختیار کیا ہے۔ اقبال نے یہ استفسار اپنے آپ سے بھی کیا ہے، خدا سے بھی اور اپنی قوم سے بھی۔

درونم جلوۂ افکار ایں چیست؟ — برون من ہم اسرار ایں چیست؟
بفرما اے حکیم نکتہ پرداز — بدن آسودہ جاں سیار ایں چیست؟

فلسفیانہ رباعیات

رباعیاتِ اقبال کے گنجِ گراں مایہ میں فلسفے کا حصہ معلوم کرنے سے قبل فلسفے کی حقیقت اور فلسفہ و اقبال کا باہمی تعلق معلوم کرنا بے حد ضروری ہے۔ فلسفہ، جیسا کہ مسلّم ہے، تلاشِ دانش کا نام ہے دانش مندی کا نہیں۔ اس لحاظ سے فلسفی دانش ور نہیں بلکہ جویائے دانش ہے۔ یہ جویائے دانش (فلسفی) کون سی دانش کی تلاش میں رہتا ہے اور ابھی تک اس نے کیا کچھ معلوم کیا ہے اس کی حقیقت تو علومِ قطعیہ کے ماہرین سے پوچھیئے۔ البتہ فلاسفہ کی آراء کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ فلسفی نے مابعد الطبیعیات مثلاً مسئلہ علم و وجود، مسئلہ صداقت و کذب، مسئلہ خیر و شر، مسئلہ زمان و مکان اور ذہن و بدن کے مابین تعلق کا مسئلہ وغیرہ۔ حقائق کو معلوم کرنے میں اپنی تمام تر ذہنی قوتیں صرف کر ڈالیں، لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ تیر متحرک ہے یا ساکن۔ اصل وجود محسوس ہے یا قوت۔

قطعی علوم نے انسان کی معاشی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا اور مذہبی علوم نے اس کی معاشرتی و اخلاقی زندگی کو تسلی بخش حد تک خوشگوار بنا دیا لیکن بے چارہ بوڑھا فلسفہ انگشت بدنداں، ششدر و حیران اس انقلاب کو دیکھتا ہی رہ گیا۔

گویا فلسفہ شکوک و شبہات، حیرت اور گومگو کی اس کیفیت کا نام ہے جس میں قوتِ عمل مضمحل اور قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں۔

اقبالؔ مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور دولتِ یقین و ایمان سے مالا مال۔ یونیورسٹی کی زندگی میں انہیں مطالعۂ فلسفہ کا کچھ نشہ سا ہو گیا تھا جس کی تسکین کے لئے مے خانۂ مشرق کے بعد وہ مے خانۂ مغرب کی طرف متوجہ ہوئے (ع۔ بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے مے خانے) لیکن اس کے نرالے دستور اور بے ذوقیٔ صہبا سے جلد بدمزہ ہو گئے اور جب وطن واپس آئے تو دولتِ یقین و ایمان سے مالا مال تھے۔

نیازؔ فتح پوری صاحب لکھتے ہیں:

"یورپ میں انہوں (اقبالؔ) نے یونانی فلاسفہ کا از سرِ نو مطالعہ کیا، حکمائے اسلام کے نظریوں پر پھر انتقادانہ نگاہ ڈالی، مغرب کے فلاسفۂ جدید کے افکار پر غور کیا، اشراقیین اور متصوفین کے خیالات پر نگاہِ غائر ڈالی اور آخر کار جب وہ یورپ سے واپس آئے تو ایک مخصوص نظریۂ حیات، ایک متعین فلسفۂ زندگی کا شعور لے کر لوٹے۔" (نگار۔ اقبال نمبر)

ایک اور واقفِ حال کی رائے ہے:

"گیا تھا فلسفی بننے کے لئے، آیا نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر، گیا تھا سازِ عقل لے کر آیا سوزِ عشق لے کر۔"

یہ مخصوص نظریۂ حیات، یہ متعین فلسفۂ زندگی، یہ سوزِ عشق کیا چیز تھی، اس کی وضاحت خود اقبالؔ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"جو کچھ میں کہتا ہوں وہ فلسفۂ حقۂ اسلامیہ ہے، نہ کہ فلسفۂ مغربی۔"

(مقالاتِ اقبالؔ۔ مقالہ ۱۲)

فلسفۂ حقۂ اسلامیہ، عشق و یقین کے مجموعہ کا نام ہے اور یہی ہے رباعیاتِ اقبالؔ کا پیغام۔

رباعیاتِ اقبالؔ میں فلسفے کا حصہ معلوم کرنے کے لئے درج ذیل دو رباعیاں قابلِ غور ہیں:

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر | شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں | مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

گریزد آخر ز عقل ذو فنوں کرد | دلِ خود کام را از عشق خوں کرد
ز اقبالِ فلک پیما چہ پرسی | حکیم نکتہ دانِ ما جنوں کرد

اس تفصیل کے بعد مجھے یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ رباعیاتِ اقبال میں غمزدہ فلسفہ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اقبال قوم کو شکوک و شبہات کے بجائے عشق و یقین کی تعلیم دینے آئے تھے۔ ان کا پیغام جمود و تعطل نہیں تھا جہد و عمل تھا۔

عنوانات کے تحت تقسیم میں ہم نے رباعیاتِ اقبال کا مطالعہ کیا ہے، آئیے اب اقبال کی رباعیات کے محاسن و معائب پر بھی کچھ غور کریں۔

رباعی، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے، مشکل ترین صنفِ سخن ہے..... اقبال نے اس مشکل ترین صنفِ سخن میں فصاحت و بلاغت کے جو گلزارِ رشکِ ارم پیدا کئے ان کا حسن اور رعنائی سدا بہار ہے۔ ایک ایک پھول کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا اور جنت نگاہ کا سامان حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان گُل ہائے خوش نما پر تشبیہ، استعارہ، کنایہ، تلمیح، تضمین، تعریض اور حذف ایجاز کی بہار، جس کی تعریف کے لئے دفتر درکار ہے۔

مذہبی رباعیات ہوں یا سیاسی و سماجی، زعیمانہ و حکیمانہ اشعار ہوں یا رندانہ و عاشقانہ، یہ مختلف پیمانے اور ساغر ہیں لیکن ان سب پیمانوں میں ایک ہی شراب ہے جس کے جرعات پینے والے کے ہر قسم کے اخلاقی امراض دُور کر کے سرمستِ جہد و عمل کر دیتے ہیں۔ یہ "مے برنا" اقبال کہاں سے لائے تھے ان رباعیات میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو:

بخود باز آورد رندِ کہن را | مے برنا کہ من در جام کردم
من ایں مے چوں مغانِ دور پیشیں | ز چشمِ مستِ ساقی وام کردم

نہ از ساقی نہ از پیمانہ گفتم | حدیثِ عشق بے باکانہ گفتم
شنیدم آنچہ از پاکانِ امت | ترا با شوخیِ رندانہ گفتم

یہ چشمِ ساقی سے وام کردہ اور پاکانِ امت سے شنیدہ چیز کلام اللہ اور احادیثِ رسول اللہؐ

نہیں تو اور کیا ہے؟ یہی وہ منبع ہے جہاں سے کلامِ اقبال کے چشمے پھوٹتے ہیں اور اسلامی تعلیمات کا نغمہ سناتے ہوئے کشتِ قلوب کو سیراب کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ رباعی:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

آیت انما خلقنکم من نفس واحدۃ اور آیت انما المومنون اخوۃ کی تشریح و تفسیر ہے۔

اور یہ:

دمادم نقشہائے تازہ ریزد بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

آنحضرتؐ کے ارشاد من ساوی یوماہ فھو مغبون کا فصیح و بلیغ ترجمہ ہے۔

حسنِ کلام اور قبولِ سخن ایک خداداد چیز ہے۔ اس نعمتِ خداوندی کا جتنا حصہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب ہوا، کم کسی کو ملتا ہے۔ اقبال کے خیابانِ حیات کی دلکشی اور ان کے الہام صفت کلام کی دل نشینی پر اس قدر مقالات اور تصانیف شائع ہو چکی ہیں کہ اس پر اضافہ شاید ممکن نہ ہو۔ لیکن افسوس اور قدرے حسرت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اقبالیات پر لکھنے والوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو کلامِ اقبال کے مطالب و مفاہیم کو کما حقہ سمجھ کر قارئین کے ذہن نشین کرا سکیں۔

کلامِ اقبال ایک بحرِ بیکراں ہے۔ اس کے محاسن و محتویات گرفت کی وسعت سے زیادہ ہی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی رباعیاتِ اقبال کی فنی خوبیوں کو کما حقہٗ حیطۂ تحریر میں نہ لا سکا۔ یہ اعتراف ہی میری طرف سے اقبال کو سب سے بڑا خراجِ عقیدت ہے۔